تصورِ تعلیم اور عملِ تعلیم کے تقاضے

انسانی دنیا میں علم ترقی پذیر رہا ہے اور رہے گا، ہر آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل سے علم و فن سیکھتی رہی اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ترمیم و اضافے کا کام سرانجام دیتی رہی۔ علم کا ایک فرد سے دوسرے فرد تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونا عمل تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن کیا تعلیم کا تصوّر اتنا ہی محدود اور تنگ دامن ہے کہ معلومات کا ایک بوجھ اِدھر سے اٹھا کر اُدھر رکھ دیا جائے؟ یا تصورِ تعلیم اس سے کہیں وسیع تر اور عظیم ہے۔

مقاصدِ تعلیم کی وسعت کی طرف ہر دور کے دانشوروں نے رہنمائی کی ہے ان میں سے چند عالمی شخصیات کے افکار و خیالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تعلیم-سچائی، حسن اور خیر کی دریافت

سقراط (۴۶۹ ق م-۳۹۹ ق م) نے کہا ''تعلیم سچائی، حسن اور خیر جیسے عالمگیر اصولوں کی دریافت کا نام ہے اور یہی اصول انسانی رویوں پر حکمرانی کرتے ہیں'' گویا تعلیم کا مقصد سچائی کی تلاش، حسن کے پھیلاؤ، اور خیر کا غلبہ ہے اور اس کا اندازہ انسانی رویوں سے ہوگا کہ حسن کا پھیلاؤ ہو رہا ہے یا بدصورتی اور گندگی کو فروغ مل رہا ہے، انسانی دنیا میں خیر غالب ہو رہا ہے یا شر کی حکمرانی ہے۔ اور سچ کہا سقراط نے کہ اگر سچائی، حسن اور خیر جیسے عالمگیر اصول انسانی رویوں پر حکمرانی کر رہے ہیں تو تعلیم کا مقصد پورا ہو رہا ہے اور اگر ایسا نہیں ہو رہا تو تعلیم اپنے مقاصد کو حاصل میں ناکام ہے۔

تربیت-معاشرے میں بہترین افراد کی تیاری

ارسطو (۳۸۴ ق م-۳۲۲ ق م) نے کہا ''تعلیم فرد کی تربیت کا عمل ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکے، اور معاشرے کا بہترین فرد بن سکے۔ صلاحیتوں کی اس تکمیل کی بنیاد عقل اور آزاد ارادے پر ہے'' گویا تعلیم انتقالِ معلومات نہیں بلکہ فرد کو اس انداز میں تیار کرنا کہ وہ اپنی طبعی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں استعمال میں لا سکے، اور صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کے نتیجے میں وہ معاشرے کا کارآمد اور اچھا فرد بن سکے، ظلم و جبر کے ذریعے دوسرے کے حقوق کا غاصب نہ بن سکے۔ اور یہ کہ صلاحیتوں کی تکمیل کی بنیاد عقل اور آزاد ارادے پر ہے۔ غالباً خالقِ انسان کی مرضی بھی یہی ہے کہ عقیدہ و فکر کے اختیار میں جبر و اِکراہ کو ناپسند کیا، اور پوری آزادی سے غور و فکر، تقابل اور جائزے کی دعوت دی تاکہ ہر شخص خیر و شر کے اختیار میں خود مختار بھی ہو اور پھر اس کے فائدے اور نقصان کا ذمہ دار بھی خود ہو۔ معلّم و مرشد کی ذمہ داری صرف یہ رکھ دی گئی کہ وہ اچھا برا کھول کر بیان کر دے۔ اگر انسانوں کو الہامی ہدایت اور وحی کی روشنی میسر نہ ہو تو آزادی افکار انہیں فکر و عمل کے جنگلوں میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اس اعتبار سے ارسطو کا یہ کہنا کہ صلاحیتوں کی تکمیل عقل اور آزاد ارادے سے ہوتی ہے بڑی حد تک درست ہے لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے، اقبالؒ نے بجا فرمایا

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ (ضربِ کلیم)

ذہنی و بدنی نشوونما کے ذریعے انسان کو مثالی شہری بنانا

افلاطون (۴۲۴ ق م-۳۴۷ ق م) نے فرمایا ''تعلیم فرد کے ذہن وجسم کی اس طرح نشوونما کا نام ہے کہ وہ اپنے آپ کو مثالی شہری بنا کر ذاتی و معاشرتی تکمیل کر سکے'' گویا تعلیم کا مقصد انسان کی ذہنی و جسمانی نشوونما اور ترقی بھی لیکن اسے ان صلاحیتوں کو اس لیے پروان چڑھانا ہے تا کہ وہ معاشرے کا مثالی فرد بن سکے، اور ایک فرد کا مثالی بننا اُس کی ذات کی تکمیل بھی ہے اور معاشرے کی بہتری بھی۔

معرفت کا حصول اور کائنات کے حقائق سے آگاہی

ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) فرماتے ہیں، ''تعلیم کا مقصد معرفت کا حصول اور فرد کو کائنات کے حقائق سے آگاہ کرنا ہے''

معرفت خداوندی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا

امام غزالی (۱۰۵۸ء-۱۱۱۱ء) فرماتے ہیں، ''تعلیم کے ذریعے فرد کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ معرفت خداوندی حاصل کر کے اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکے''

امام غزالی تعلیم کو ایک خالص مسلم انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کم از کم مسلم معاشرے کے لیے تو یہ لازمی قرار دیا جائے گا کہ وہاں کا نظام تعلیم افراد کو معرفت الٰہی سے آگاہ کرے اور پھر اس کے احکام و تعلیمات کے ذریعے ایک بہتر زندگی گزارنے کا طریقہ سکھائے اگر مسلم معاشرے کا نظام تعلیم یہ مقصد پورا کرنے سے قاصر ہے تو وہ اسلامی نظام تعلیم نہیں کہلائے گا۔

فطری ادراک کی تربیت، اور معرفت الٰہی کا حصول

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) فرماتے ہیں کہ ''تعلیم کا مقصد انسان کے فطری ادراک کی تربیت کرنا ہے تا کہ اسے معرفت الٰہی حاصل ہو سکے''

گویا انسانی فطری ادراک کی تربیت کرنا اور اسے اس انداز سے پروان چڑھانا کہ معرفت الٰہی تک پہنچنا اس کے لیے آسان ہو جائے، یہی تعلیم کا مقصدِ اوّلین ہے۔

یونانی اور مسلم دانشوروں کی طرح دنیا بھر کے دیگر اہل علم و بصیرت بھی کم و بیش وہی بات کر رہے ہیں جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی چند مغربی مفکرین کی آراء کو دیکھ لینا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

مغربی مفکرین کی آراء

پارکر Parker کا کہنا ہے کہ ''تعلیم بچے کی تربیت کا ایسا عمل ہے جس کے ذریعے بچوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کی سرگرمیوں کو منظّم طریقے سے سرانجام دے سکیں، محنت سے محبت کریں، اور اپنے دل دماغ کی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا سکیں''

گویا تعلیم-تربیت کا ایک مسلسل عمل ہے،

- اس عمل کے ذریعے بچوں کو منظّم طریقے سے زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔
- انکی تربیت (training) اس طرح سے کی جاتی ہے کہ وہ خود ہی محنت سے محبت کرنے لگتے ہیں۔
- محنت سے محبت کی بنیاد پر وہ اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فریڈرک ہربرٹ (Friedrich Herbart) (۱۷۷۶ء-۱۸۴۱ء) کا کہنا ہے کہ ''تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس میں مختلف سرگرمیوں کے ذریعے فرد کی ذات میں اعلیٰ ترین رویے پیدا کیے جاتے ہیں''

— گویا تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی رویوں کو درست کرنا ٹھیرا۔

بینجمن رُش (Benjamin Rush) (۱۷۴۶ء-۱۸۱۳ء) کا کہنا ہے: ''تعلیم بہتر افراد، بہتر، قوم اور بہتر انسانیت پیدا کرنے کی بامعنی کوشش ہے'' گویا تعلیم کا اصل مقصد تو پورے معاشرے کی بہتری ہے لیکن یہ کام بڑی ہوش مندی اور دانائی سے کرنا چاہیے اور مسلسل کرنا ہے۔

فروبل (Froebel) (۱۷۸۲ء-۱۸۵۲ء) کا کہنا ہے ''تعلیم زندگی کو خوشگوار بنانے کی تیاری اور زندگی کے صحیح اصولوں سے واقفیت کا عمل ہے۔ فروبل کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد تو زندگی کو خوشگوار بنانا ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زندگی کے صحیح اصولوں سے واقفیت نہ حاصل کر لی جائے۔ اور زندگی کے صحیح اصول کیا ہیں؟ یقیناً وہی جو انسانوں نے مختلف تجربات، تخیلات اور الہام و وحی سے حاصل کیے اور جن پر انسانوں کی اکثریت کا اتفاق ہے۔

روسو (Rausseau) (۱۷۱۲ء-۱۷۷۸ء) کا فرمان ہے ''تعلیم فطری ماحول میں بچے کی انفرادیت کی نشوونما ہے'' روسو کے نزدیک ہر بچہ فطرت کی طرف سے کچھ انفرادی خصوصیات اور صلاحیتیں لے کر آتا ہے اگر تعلیم کا نظام اسے ایسا فطری ماحول فراہم کرتا ہے جس سے اسکی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں تو یقیناً وہ ایک کامیاب نظام تعلیم ہوگا۔

جان ڈیوی (John Dewey) (۱۸۵۹ء-۱۹۵۲ء) کا فرمان ہے: ''تعلیم تجربے کی تعمیر نو یا تنظیم نو ہے، جو تجربے کے معانی میں اضافہ کرتی ہے، اور جس سے مستقبل کی سرگرمیوں اور تجربات کی راہ متعین کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے''۔

گویا انسانی تجربے کی تعمیر نو جس سے نئے نتائج سامنے آئیں، نئی راہیں کھلیں، اور انسان کا مستقبل نئی سرگرمیوں کی بنیاد بناتا رہے اور اس طرح ہر نیا تجربے سابقہ تجربے کی بنیاد پر ترقی پاتا رہے اور انسانی زندگی تجربات کے تسلسل کو آگے بڑھاتی رہے۔

چند مزید تعلیمی تصورات

علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) فرماتے ہیں ''تعلیم عرفان خداوندی اور تکمیل خودی کا ذریعہ ہے''

علامہ نے مختصر انداز میں دو باتوں کو تعلیم کا مقصد و محور بنایا ہے، ایک عرفان رب دوسرا تکمیل خودی۔ اور علّامہ کے نزدیک خودی، عرفان ذات ہے، گویا عرفان ذات کے ذریعے عرفانِ الٰہی حاصل کرنا، اور عرفان خدا کی روشنی میں اپنی ذات کی تکمیل کرنا، اور جو نظام تعلیم ان دو مقاصد کو پورا کر رہا ہو وہی درست ہے۔

سیّد مودودیؒ (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) فرماتے ہیں، ''تعلیم خیر کی قوّتوں کو فعل میں لانے کا عمل ہے، پیدائشی طور پر انسان کے اندر خیر و شر کی قوتیں موجود ہوتی ہیں، تعلیم کا کام ہے کہ وہ شر کی قوتوں کو دبا کر خیر کی قوتوں کو اجاگر کرتی ہے اور انسان کو رضائے الٰہی کے حصول کے قابل بناتی ہے''۔

سید مودودی کی تعریف کی رو سے تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے:

— خیر کو قوتوں کو فعل یعنی عمل کی صورت میں ظاہر کرنا۔

— شر کی قوتوں کو دبانا اور خیر کی قوتوں کو ترقی دینا۔

— رضائے الٰہی کا حصول

جس طرح افراد نے تعلیم کے حوالے سے اپنے افکار کا اظہار کیا ہے اسی طرح اداروں نے بھی کسی مشاورت کی بناء پر تعلیم کے مقاصد متعین کیے ہیں۔

یونیسکو(UNESCO) نے تعلیم کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

''تعلیم ایک باضابطہ عمل ہے، جس کے ذریعے علوم، مہارتیں اور ایسی بصیرت دوسری نسلوں تک منتقل کی جاتی ہے جو زندگی کی سرگرمیوں میں اہمیت کی حامل ہوتی ہے''

— گویا تعلیم ایک باضابطہ عمل ہے، بے قاعدگی اور بے ربط سرگرمیوں کا نام نہیں ہے،

— تعلیم مختلف قسم کے ایسے علوم، مہارتیں اور بصیرت دوسری نسلوں کو منتقل کرتی ہے جن کی زندگی میں کوئی اہمیت اور افادیت ہو۔

دائرہ معارف تعلیم (Encyclopedia of Education) کے مطابق:

''تعلیم ایسی سرگرمیوں کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے ایک معاشرہ اپنے علوم، اپنی مہارتیں، اور مقاصد دوسری نسلوں تک منتقل کرتا ہے تاکہ معاشرتی وجود اور نمو کو یقینی بنایا جائے''۔

اسی طرح دنیائے علم کا ایک معتبر و معروف انسائکلو پیڈیا (Encyelopedia of Britanica) میں تعلیم کی تعریف یوں تحریر کی گئی ہے۔

''تعلیم زندگی کے بنیادی عقائد کی بنیادوں کا تنقیدی مطالعہ اور ان عقائد کے اظہار کے لیے استعمال کیے جانے والے بنیادی تصورات کے تجزیے کا عمل ہے''

اگر ہم سابقہ تعریفات کا جائزہ لیں، اور دنیا کے دیگر خطوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا بھی مطالعہ کر لیں تو درج ذیل نتائج کھل کر سامنے آتے ہیں۔

تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس سے:

- انسان معرفتِ ذات و کائنات کے ذریعے خالق کائنات کی مرضی کے مطابق معاشرے کی تشکیل و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔
- انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیداری اور ترقی ملے۔
- انسان خیر کی قوتوں کو پروان چڑھانے اور شر کی قوتوں کو دبانے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔
- انسانی تجربات کو ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کر سکے۔

ابھی تک چند افراد اور کچھ اداروں کے تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ تعلیم کا مفہوم اور حقیقی تصور واضح ہو جائے۔ یہ سوچ بھی اسی عملِ تحقیق کا نتیجہ ہے کہ دنیا بھر کے مفکروں نے بلاتفریق خطہ، رنگ و نسل کس نتیجے کو اخذ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کی دنیا بھر کے دانشوروں کی طرف سے کی گئی تعلیم کی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور بہت اچھا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ان محققین کی تعریفوں میں لفظی فرق صرف اس وجہ سے ہے کہ سماجی علوم میں اس امر کی گنجائش ہوتی ہے کہ ہر فرد اپنے زاویۂ نگاہ سے کسی بھی شئے کو دیکھے اور پھر اسی مخصوص زاویۂ نظر سے اس کی تعریف کر دے۔ اگر ان تعریفوں کو کسی دوسرے زاویۂ نظر سے تنقیدی انداز میں دیکھا جائے تو ان تعاریف کی خامیوں کی نشاندہی بھی مشکل نہیں۔ تاہم یہ طے ہے کہ سب نے تعلیم کے بنیادی تصور سے اتفاق کیا ہے۔ ہاں تعلیم کے اطلاق کے حوالے سے مختلف معاشروں میں امتیاز فطری امر ہے، اور اس سے مایوس یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ مگر دنیا بھر کے لوگ ان فروعی اختلافات کے باوجود تعلیم کو خیر ہی کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ یہی سب مفکرین کی تعریفوں میں مشترکہ پہلو ہے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ تعلیم نہ صرف انفرادی زندگی کو بلکہ معاشرے کو خوشنمائی عطا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے نتیجۂ تعلیم کے حوالے سے مشرق اور مغرب میں کوئی تقسیم نہیں، بلکہ مکمل اتفاق موجود ہے۔ دونوں تہذیبوں کے ہاں یہ شعور موجود ہے کہ علم جہاں سے بھی ملے اُسے حاصل کرنا ہی دانائی کی دلیل ہے۔

چنانچہ تمام طالبینِ علم اور معلمین کا یہی مشن ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زیادہ توانائیاں حصولِ علم پر صرف کریں۔ چنانچہ عملِ تعلیم کے نتیجے میں معرفتِ ذات، کائنات اور خالقِ کائنات کے ذریعے سے خالقِ کائنات کی مرضی کے مطابق معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے۔ ایسے معاشرے کی تشکیل پر مسلسل زور دینے سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ خیر کی قوتیں آج تک خالقِ کائنات کی مرضی کا معاشرہ تشکیل نہیں دے سکیں۔ اس لیے مسلسل اس کی تائید کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ معاشرہ کسی عمارت کی طرح کوئی ساکت وصامت شئے نہیں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے اُسے تعمیر کر دیا تو وہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی، بلکہ معاشرہ ایک زندہ، تغیر پذیر اور نمو آشنا entity ہے، اس لیے اسے ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق جدید تر بنائے رکھنے کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ جہاں خیر کی قوتیں معاشرے کو جدید اور مہذب ترین بنانے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں، وہاں اس کے ساتھ ساتھ شر کی قوتیں اس میں بگاڑ پیدا کرنے اور غیر مہذب شکل میں لوٹانے کی مسلسل سعی کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ان منفی قوتوں سے معاشرے کا مسلسل دفاع ضروری ہے اور وقتی ٹوٹ پھوٹ کی اصلاح کا عمل بھی فطری طور پر مسلسل ہونا چاہیے۔ چنانچہ تعلیم کی تمام تعاریف کا نچوڑ یہی ہے کہ معاشرے کو خالق کی مرضی کے مطابق تشکیل دینا اور اس کی ترقی (اور تحفظ بخلافِ قوتِ شر) میں فرد کا مؤثر کردار ادا کرنا تعلیم کا اہم ترین مقصد ہوگا۔

لفظ تعلیم پر ذرا سا غور کیجیے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ مگر یہ فارسی، اُردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں یہ خوبی ہے کہ اس میں ایک لفظ فقط ایک لفظ نہیں ہوتا۔ اس میں معانی کے مختلف shades موجود ہوتے ہیں، جو ایک ہی عمل کے مختلف عناصر اور کوائف کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر shade کا الگ مخصوص حسن ہوتا ہے۔ جب بھی آپ لفظ تعلیم پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، اس میں یہ چار خوبیاں ہر صورت میں نظر آتی ہیں۔

اوّل: آپ کے پاس کچھ علم یا معلومات ہیں جنہیں آپ کسی دوسرے (طالب علم) کے حوالے کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک عمل ہے جسے تعلیم کہتے ہیں۔

دوم: پہلے خود علم حاصل کر کے ہی اسے دوسرے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا دوسری خاصیت علم یا معلومات کو آہستہ آہستہ اور تدریج کے ساتھ ایسے پہنچانا کہ اُس کا ہر حصہ دوسرے فرد کی نہ صرف یادداشت بلکہ اس کے فہم وادراک میں رجسٹر ہو جائے۔ گویا طالب علم کی بڑھتی ہوئی صلاحیتِ تعلم کے مطابق معلومات یا علم فراہم کیا جاتا ہے۔

سوم: اس طرح تعلیم کا عمل کسی شئے کو ایک مقام (فرد) سے دوسرے مقام (طالب علم) تک منتقل کرنا یا اٹھا کر رکھنا نہیں بلکہ اس میں یہ التزام موجود ہے کہ اس طرح کی ہر سرگرمی کے تأثر کو باقاعدہ محسوس اور نوٹ کیا جائے کہ وہ مؤثر انداز میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے غذا انسانی جسم کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں قرآنی تعلیمات کی ترسیل کے سلسلے میں ''تنزیل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی قرآن کو آہستہ آہستہ اور بتدریج اُتارا گیا۔ یہ عمل 23 سال میں مکمل ہوا۔ گویا تنزیل میں تدریج کا مفہوم پہلے سے موجود ہے۔ اس طرح بتدریج آگے بڑھنے کا عمل کسی خاص وقت تک کے لیے نہیں ہے۔

چہارم: تعلیم کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ علم کو ایک فرد سے دوسرے فرد یا افراد تک پہنچانا۔ اس میں تدریج اور تسلسل کو ملحوظ رکھنا ہی نہیں بلکہ اس عمل کو یقینی بنانا بھی ہے کہ جو کچھ آپ دوسروں کو پہنچا رہے ہیں اس کا کوئی حصہ انتقال کے اس عمل میں ضائع نہ ہونے پائے۔ گویا جس مقصد کے لیے یہ منتقلی عمل میں آ رہی ہے، وہ مکمل صورت میں یا اس کے قریب ترین درجے پر حاصل ہو جائے۔ ایسے عمل کو تعلیم کہا جائے گا۔

اس طرح تعلیم کا لفظ ایک ہے، مگر اس میں متعدد مفاہیم مستور ہیں۔ جب ان تمام مفاہیم کو یکجا کر کے دیکھا جائے تب کہیں عملِ تعلیم کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ گویا تعلیم کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ لہٰذا اس کا تعلق انسان کی تمام مادّی، ذہنی، معاشرتی اور جذباتی

ضرورتوں سے براہِ راست ہے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ خواہشات پر ضرورتوں کی حد بندی کیسے لاگو کی جائے؟ اور پھر جب ضرورتوں کا تعین ہو جائے تو تعلیم کے عمل کے ذریعے ضرورتوں کی ترجیحات اور انہیں پورا کرنے کے لیے وسائل کے تعین اور ان کے بھرپور استعمال کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے، اور تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بنیادی ضرورتوں مثلاً امن، حسن اور خوشنمائی اور اس کی ترقی اور نشوونما کو آگے بڑھانا اسی وقت ممکن ہے جب تعلیم معاشرتی نمو کی بنیاد قرار پائے۔ گویا تعلیم کے سارے دائروں میں فرد اور معاشرے کا برابر برابر عمل دخل ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ نہ معاشرہ فرد کے بغیر تشکیل پا سکتا ہے اور نہ فرد معاشرے کے بغیر صحیح طریقے سے جی پاتا ہے۔

عملِ تعلیم میں نکھار کے لیے زمان و مکان کی قید سے آزادی

ہر دور میں اس مشکل کو محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ قدیم و جدید ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ انسان اور انسانی فکر کو علاقائی، لسانی اور قومی بنیادوں پر تقسیم کر کے نسلِ انسانی کو مختلف جزیروں اور ندی نالوں میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔ نہ جزیروں نے زمین کی وسعت اختیار کی اور نہ ندی نالوں کو محیطِ بے کراں میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی، حالانکہ پوری نسل انسانی ایک ہی شجر سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں یہ تنگ نظری دکھائی دیتی ہے وہیں ایک ایسا گروہ بھی دکھائی دیتا ہے جو پوری انسانیت کی بات کرتا ہے اور ساری زندگی اور زندگی کی تمام صورتوں میں کامیابی، امن، خوشی، اور حسن دیکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ محترم میں انبیاء و رسل بھی شامل ہیں، اور اہل تقوی و دانش بھی ہیں۔ جماعتِ انبیاء کے قائد محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں

الحکمۃُ ضالّۃ المومن، یأ خُذُ ھا مِمَن سَمِعَھَا

(حکمت مومن کی گم کردہ متاع ہے، وہ اسے جس کے ہاں سنتا اور پاتا ہے حاصل کر لیتا ہے۔) یونانیوں کے سقراط و بقراط، ارسطو اور افلاطون، مشرق میں بودھا، کنفیوشس، مسلم و مسیحی دانشور یہی کہتے رہے اس لیے عمل تعلیم میں — درسی لوازمہ ہو یا طریق مناھج، وسائل ہوں یا اسالیب — سب میں سب سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے بجا فرمایا

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اور زمانے کے حوالے سے فرماتے ہیں

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

تعلیم کا دائرہ

انسانی زندگی چونکہ مسلسل ترقی کر رہی ہے، اگر بعض حوالوں سے کچھ تنزل اور خرابی بھی دکھائی دے رہی ہو تب بھی مجموعی طور پر زندگی میں ترقی کا رجحان غالب رہتا ہے، اس لیے تعلیم کا تعلق بھی زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، اسے فرد اور معاشرے کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا ہے چاہے وہ ضرورتیں مادی ہوں یا روحانی و جذباتی۔ اس لحاظ سے تعلیم کا تعلق زندگی کے تمام گوشوں اور میدانوں سے اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آئیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم زندگی کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹ سکتے، بلکہ یہ ایسے جسم کی مانند ہے جس میں مختلف قسم کے اعضاء (اجسام) بظاہر الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب مل کر زندگی کو رواں دواں رکھ رہے ہوتے ہیں۔

تعلیم کا عمل کیسے آگے بڑھا؟

جب سے خالق انسان نے انسان کو تخلیق کیا اسی وقت سے اس کی تعلیم کا اہتمام بھی کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے تو رب ذوالجلال نے خود انسان کو تعلیم دی اور اسے تمام اشیاء کے نام سکھائے، [وعلّم آدَمَ الاُسماء کلّھا]

پھر کچھ باتوں کا علم اور احساس اسکی جبلّت میں داخل کر دیا گیا، اس کے بعد سمع و بصر اور فہم و شعور کی نعمت عطا کر کے دنیا میں اس طرح بھیجا کہ وہ دنیا میں موجود ہر مخلوق سے کچھ نہ کچھ مسلسل سیکھ رہا ہے۔

اس نے پتھروں اور فولاد کو دیکھا تو قوت، صلابت اور ثابت قدمی کا جوہر سیکھا، اور اسے انسانی زندگی میں خیر اور اچھائی کی علامت بنا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے ناموں میں بھی اس کا اظہار کرنے لگا، عرب دنیا میں حجر اور صخر کا نام معروف ہے، جبکہ مغرب میں Stone اور Rock نام بھی نامانوس نہیں ہیں۔ انسان نے افلاک کی بلندیوں پر غور کیا تو اپنی فکر کو بلندیوں کا رجحان عطا کیا اور سوچ کے نئے در کھولے۔ صحراؤں اور سمندروں کے پھیلاؤ کو دیکھا تو اپنے دامن علم کو کشادہ کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ بادِ صبا سے لطف و قرار کا مطلب سمجھا۔ پرندوں، پانی کے جھرنوں اور ہوا کی سرسراہٹ سے نغمہ سرائی سیکھی۔

شہد کی مکھی پہ غور کیا جو کڑوے کسیلے پھلوں پھولوں سے میٹھا شفایاب شہد بناتی ہے تو انسان نے بھی زہر سے تریاق اور بے لذّت چیزوں کو لذیز بنانے کا فن سیکھ لیا۔

ریشم کے کیڑے نے خود کو فنا کر کے دوسروں کا تن ڈھانپنے کا سبق دیا، چاند کی روشنی نے محبت اور زندگی میں ذائقہ بھرنا سکھایا اور سورج کی روشنی نے جوش و جذبہ سکھانے کے ساتھ ساتھ یاس اور ناامیدی کو امید میں بدلا۔ تاریکی کے بعد روشنی، زوال کے بعد عروج کی تعلیم دی، اس کے ساتھ ساتھ وقت کی پابندی اور مسلسل عمل کے حوالے سے رہنمائی دی۔ دن کے اجالے نے حرکت اور اجلا پن سکھایا تو رات کی تاریکی نے پردہ پوشی اور رازداری سکھائی۔

چیونٹیوں سے انسان کو مسلسل محنت کا سبق ملا، اور مکڑی نے گھات لگانے کا فن سکھایا۔

بادل جب آبِ حیات تقسیم کرتے ہوئے جغرافیائی سرحدیں عبور کرتے ہیں تو علم کے حصول اور ترویج میں مشرق و مغرب کی قید سے آزادی کی ترغیب ملتی ہے۔ پھولوں، پھلوں، پرندوں اور دیگر مخلوقات میں رنگ، شکل، قامت کے اختلاف کے باوجود تعاون انسان کو اختلاف کے باوجود ربط و اتفاق کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس حوالے سے پوری کائنات کی ساری مخلوقات کسی نہ کسی طرح انسان کو تعلیم بھی دے رہی ہیں اور اسے تعلیم کے عمل کو بہتر بنانے کا فن بھی سکھا رہی ہیں۔

— دن اور رات کے آنے جانے میں روزانہ کا تکرار

— موسموں کی تبدیلی سے سہ ماہی شش ماہی اور سالانہ بنیادوں پر تعلیمی مراحل کو چلانے کی ترغیب و تائید ملتی ہے۔

نباتات و جمادات و حیوانات کا باہمی تعاون عمل تعلیم میں معلم + طالب علم، معلم + معلم - طالب علم + طالب علم کے باہمی ربط اور تعاون کو فروغ دینے کا باعث ہے۔ گویا مخلوقات کائنات اور نظام کائنات تعلیم اور عمل تعلیم کو بہتر، مفید اور مؤثر بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔

تعلیم کے مقاصد

سابقہ تعریفوں میں اگرچہ مقاصد تعلیم کا نظریاتی جائزہ لیا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود انہیں دو حصّوں میں تقسیم کرنا فائدے سے خالی نہیں۔

تعلیم کا اساسی مقصد: ہر قسم کے نظام تعلیم کا عمل تعلیم کے اساسی مقاصد میں آدمی کو ایک اچھا انسان بنانا ہونا چاہیے، اور ایک اچھے انسان کے لیے اس کے عقائد کی دُرستی، عدل کی پاسداری اور معاملات میں سچائی و امانت داری لازمی ہے ان کے بغیر کوئی شخص اچھا انسان نہیں بن سکتا۔

فرعی مقصد: تعلیم کے فرعی مقصد میں ہر شخص کو اپنے فن، ہنر اور صلاحیت میں ماہر بنانا لازمی ہونا چاہیے۔ جیسے معلم، ڈاکٹر، سائنس دان، انجنیئر، ماہر قانون، ماہر تجارت ماہر زراعت وغیرہ.....

جب تک اساسی مقصد اور فرعی مقصد کو کسی شخصیت میں یکجا نہ کر دیا جائے اس وقت تک حقیقی خوشی اور اصلی راحت میسّر نہیں آسکتی۔ بدقسمتی سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے فرعی مقصد کو اساسی مقصد بنالیا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک ڈاکٹر، انجنیئر، سائنس دان، عالم، موسیقار، اور ایڈمنسٹریٹر تو بن جاتا ہے انسان نہیں بن پاتا۔

علامہ محمد اقبال صحیح طور پر نشاندہی فرماتے ہیں۔

سُرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر　　گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی　　بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات　　نہ کر سکیں تو سراپا فسُونُ و افسانہ

عمل تعلیم کیا ہے؟

''عمل تعلیم وہ ترتیب وار سرگرمیاں ہیں جو نظام تعلیم کے مقاصد کے حصول کے لیے وقوع پذیر ہوتی ہیں''

ان سرگرمیوں کے ادراک اور تعین میں جن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے وہ درج ذیل ہیں:

عمل تعلیم کا مرکز و محور- طالب علم

تمام تر نظام ہائے تعلیم، تعلیمی مراکز، تعلیمی سرگرمیاں صرف اور صرف اس لیے معرض وجود میں آتے ہیں کہ ایک طالب علم کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ اپنے اساسی و فرعی مقاصد کو بآسانی حاصل کر سکے۔ اور مختلف مراحل و اوقات میں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ایک طالب علم کو عمل تعلیم کے ذریعے کیا؟ کیسا؟ اور کتنا؟ حاصل ہوا اور اس کے نتیجے میں اسکی فکر، صلاحیت اور کردار میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اگر وہ تبدیلیاں اسکی اپنی ذات اور معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں تو عمل تعلیم کامیابی سے مکمل ہو رہا ہے۔

عمل تعلیم کو کامیاب بنانے کا ایک زریں اصول

تعلیم اور تعلّم کے میدان میں کام کرتے ہوئے چار قسم کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے، اور ان چاروں سے مختلف انداز میں معاملہ کرنا چاہیے۔ ایک شخص وہ ہے جو جانتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ وہ عالم ہے اس سے سیکھو۔ یعنی ایسے شخص کو علم و ہنر حاصل ہے اور وہ اپنی اس خوبی اور صلاحیت سے بخوبی واقف ہے، اس سے سیکھنا چاہیے۔ وہ معلم بننے کا حق دار ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جو نہیں جانتا۔ اور وہ جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا۔ وہ طالب ہے، اسے سکھاؤ۔ یعنی اس شخص کو اپنے کم علم اور بے ہنر ہونے کی خبر ہے، اور یہی احساس اس کے اندر طلب کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایسے فرد کو علم و ہنر سے آشنا کرنا چاہیے۔

تیسرا فرد وہ ہے جو جانتا ہے، لیکن وہ نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔ وہ سویا ہوا ہے اسے جگاؤ۔ یعنی ایسے فرد کو قدرت کی طرف سے مختلف صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے لیکن وہ اپنی ان خوبیوں اور صلاحیتوں سے بے خبر ہے، اس خوابیدہ شخص کو جگانا چاہیے اور اسے اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے اور نکھارنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔

چوتھا فرد وہ ہے جو نہیں جانتا، اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا، ایسا شخص جاہل ہے اور کسی ایسے وہم میں مبتلا ہے جس نے یا تو اسے بالکل غافل بنا دیا ہے اور یا وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے مرد ناداں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ ایسے فرد سے کنارہ کش رہنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

عمل تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے چند بنیادی عناصر کا بہترین شکل میں وجود اور باہمی امتزاج ہونا ضروری ہے۔ ان عناصر میں سے ایک اہم ترین عنصر استاد ہے۔ (مثالی استاد کے حوالے سے الگ گفتگو ہوگی، ان شاء اللہ) لیکن ہر استاد کا اپنے مضمون اور فن میں ماہر ہونا، اپنے کام سے مخلص ہونا اور ایک اچھے منصوبے (Planing) کے ساتھ تعلیم کا فریضہ انجام دینا لازمی ہے۔

نصاب تدریس

مضمون چاہے جیسا بھی ہو تعلیم کے عمل کو کامیاب بنانے کے لیے نصاب کو بہتر، کارآمد، واضح اور تدریج کے ساتھ اس طرح مرتب ہونا چاہیے کہ وہ طالب علم کی ضرورت کو نہ صرف پورا کرے بلکہ اس کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کا راستہ بتائے۔

ہر نصاب تعلیم میں درج ذیل بنیادی خصوصیات کا ہونا لازمی ہے— کہ وہ

☆ تعلیم کے بنیادی اور فرعی مقاصد کو پورا کرنے والا ہو

☆ طالب علم کی تعلیمی سطح اور ضرورت کے مطابق ہو

☆ عصری تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو

☆ مقررہ مدّت میں پورا ہونے والا ہو

☆ ہر طالب علم اور استاد کو بآسانی مل سکے اسکی دستیابی میں کوئی مشکل نہ ہو

نصاب تعلیم کے ہیکل عام کو مرتب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ترتیب کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یقیناً کارآمد رہے گا۔

- نظام تعلیم میں پہلے آٹھ سال کے نصاب کا مرکزی اور بڑا حصّہ زبان، اخلاقیات اور حساب پر مشتمل ہونا چاہیے۔
- اگلے چار سال (۸ سے ۱۲ سال) کی تعلیم میں طالب علم کی ذہنی سطح کے مطابق زبان، اخلاقیات، حساب، تاریخ، فطری علوم، اطلاقی علوم، سماجی علوم، ایک مناسب امتزاج اور مقدار میں ہونے چاہییں۔
- مزید چار سال (۱۳ سے ۱۶ سال) کسی ایک میدان میں تخصص کے لیے بنیادی مضامین، اطلاقی علوم ضرورت کے مطابق؛ فکر و فلسفہ، اخلاقیات، ایک خاص مقدار اور امتزاج کے ساتھ۔
- مزید ۲ سال (۱۷-۱۸ سال) ماسٹر ڈگری متعلقہ میدان میں تخصص اور اسکے بعد تخصص مزید کے لیے ڈاکٹریٹ، پوسٹ ڈاکٹریٹ کا عمل چلتا رہتا ہے۔

لیکن نصاب تعلیم میں ہر مرحلے کی مناسبت سے خوب غور و خوض کے بعد ہی مضامین اور ان کی مقدار کا تعین کرنا چاہیے۔ کیونکہ بعض تعلیمی اداروں میں دیکھا گیا ہے کہ موجود اور میسر اساتذہ کو دیکھ کر نصاب تعلیم مقرر کر دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر سمسٹر سسٹم کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارے اس مرض میں جلد مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر مضامین اور نصاب کا تعین ہونا چاہیے۔ ایسے تعلیمی اداروں میں استاد کے بدلنے سے نصاب بدل جاتا ہے۔

مضامین مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں زبان (اردو، انگریزی اور عربی) کے علاوہ ریاضی اور جنرل سائنس شامل ہیں۔ کچھ اور مضامین کو تعلّم کی تقویت کے لیے شامل کیا گیا ہے، تاکہ طالب علم ایک معاشرتی حیوان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے متعلقہ صلاحیتوں کا حامل بن سکے۔ ان اضافی مضامین کو بھی کم اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔

اس کے بعد سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری مراحل ہیں، جن میں مضامین کی تعداد بتدریج کم ہوتی ہے، کیونکہ طالب علم تخصص کے قریب تر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر بنیادی سائنسوں کی مخصوص تعلیم دینے کے علاوہ اس کی اخلاقی اور معاشرتی نمو میں معاون مضامین: ادب، پاکستانیات اور اسلامیات جیسے مضامین جاری رکھے جاتے ہیں۔ اسی تسلسل میں جب فرد گریجویشن کے مرحلے سے گزرتے ہوئے ماسٹرز یا پی ایچ ڈی کے درجے تک پہنچتا ہے تو چونکہ اضافی مضامین کی معاونت کا مقصد بڑی حد تک پورا ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے اس مرحلے پر ایم اے، ایم ایس سی کی سطح پر کوئی مضمون اور پی ایچ ڈی کے درجے پر اس مضمون کا کوئی خاص موضوع ہدفِ تحقیق ٹھیرتا ہے۔

معلم کا طریقِ تدریس

نصاب کی اہمیت و افادیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ ہماری توجہ حاصل کرتا ہے کہ عملِ تعلیم و تعلّم میں استاد کے طریقِ تدریس کی کیا اہمیت ہے؟ اس میں شک نہیں کہ استاد کا طریقِ تدریس کسی خاص فرد یا گروہ کے حوالے سے حصولِ مقاصد میں بے حد معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایک مشاہدہ ہے کہ ایک ہی عمر کے بچوں کو ایک ہی ماحول میں ایک جیسی توضیحات اور معاوناتِ تدریس کے ساتھ پڑھانے والے مختلف اساتذہ کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دیگر عناصرِ تعلیم میں استاد کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے طریقِ تعلیم کا اہم کردار ہے۔ اچھے استاد کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ ''معلومات'' کو محض طالب علم کی یادداشت کے دائرے میں محدود رکھنے یا ''علم'' کو ان کی شخصیت اور کردار کا راہنما بنانے میں فرق محسوس کر سکتا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار تجربات ہوئے ہیں۔ سیکڑوں ماہرینِ تعلیم کی ہزاروں تحریروں سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ ماہرین نے اپنے اپنے تجربات کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے تمام متعلقہ افراد کی ایک مشکل سے آگاہی ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ اگر وہ گروہ کسی خاص طریقِ تدریس کو موزوں ترین سمجھتا ہے تو دوسرے کے نزدیک کوئی اور طریقہ زیادہ درخورِ اعتنا سمجھا جاتا ہے اور تمام ایسے افراد اور گروہوں کے پاس اپنے اپنے سفارش کردہ طریقے کے حق میں دلائل کا ایک لامتناہی سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ اگر کسی نے نئے طریقے کی سفارش کی ہو تو اس کی اہمیت و افادیت پرکھے بغیر اُسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اُس نئے طریقے سے پرانے تمام طریق ہائے تدریس کی نفی ہو گئی ہے۔۔ حالانکہ اس حد تک سابقہ طریقِ تدریس کی نفی فنی اعتبار سے بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ پرانے طریقوں میں کمی یا خامی کا موجود ہونا تو قرینِ امکان ہے مگر مکمل طور پر ان کا غیر متعلق ہو جانا قرینِ فطرت نہیں۔ کیونکہ معاشرتی سائنسوں میں بھی تدریج اور ترقی کا امکان تو موجود ہے، مگر ایسا نہیں کہ ایک مخصوص مرحلۂ وقت پر اچانک پچھلے سارے کے سارے حقائق غیر متعلق ہو جائیں اور کچھ نئی باتیں ان کی جگہ لے لیں۔ ترقی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گذشتہ روایات کی قطعی نفی کر کے نئے طریقے اختیار کیے جائیں۔ یہ انداز سائنسی نقطۂ نظر سے بھی متصادم ہے، کیونکہ سائنس گذشتہ تحقیق اور تجربات کو آگے بڑھانے کی سفارش کرتی ہے اور ہر دفعہ نئے سرے سے پہیہ ایجاد کرنے کو حماقت خیال کرتی ہے۔

یہ طریقہ کہ کتابی مواد من و عن طلبہ کی یادداشت میں محفوظ ہو جائے، انتہائی فرسودہ اور بیکار محض ہے۔ طریقِ تدریس میں اگر طالب علم کے دائرۂ علم میں اس طرح وسعت نہ آئے کہ اس کی صلاحیتِ کار اور قوتِ فکر میں اضافہ ہو تو یہ تعلیم نہیں بلکہ محض معلومات کا منتقل کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اسے ابلاغ بھی نہیں کہیں گے کیونکہ ابلاغ کی تکمیل بھی اسی صورت میں ہوتی ہے کہ پہنچائی گئی معلومات صرف پچھلی معلومات کے ذخیرے میں ہی اضافہ نہ کریں بلکہ انسانی صلاحیتوں میں اضافے اور رویوں کی تطہیر کا سبب بھی بنیں۔ ہو سکتا ہے بعض مضامین میں اس کلاسیکی انداز کی کسی نہ کسی حد تک اب بھی ضرورت ہو، مگر یہ طے ہے کہ محض معلومات کی منتقلی کو تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ لفظ ''تعلیم'' میں موجود جامعیت کے تقاضے محض معلومات کی فراہمی سے پورے نہیں ہوتے۔ جہاں لازمی طور پر یادداشت پر انحصار کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ یہ اصول پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ یادداشت میں محفوظ باتیں محض معلومات ہیں، ان کا علم میں منتقل ہونا بہت سی اضافی

سرگرمیوں کا تقاضا کرتا ہے۔

ایک جدید طریقِ تدریس ''پراجیکٹ'' کا طریقہ ہے۔ اسی طرح مباحثہ، اظہارِ آراء، مکالمہ وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح ایک طریقہ Demonstration Method کہلاتا ہے۔ خصوصاً بنیادی سائنسوں میں تحقیق کے طریقے کا وہ مظاہرہ اس کا اہم ترین factor ہے۔ اس میں مختلف افراد کے ذریعے تمثیل کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے بھی بعض تصورات طلبہ تک منتقل کیے جاتے ہیں اور یہ طریقے مدتوں سے روبہ عمل ہیں۔ جب تک کوئی طریقہ تعلیمی اداروں میں رائج نہیں ہوتا، یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایسا کوئی طریقہ وجود ہی نہیں رکھتا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر ممکنہ طریقے سے آگاہی رکھتا ہو اور اسی آگاہی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر سکے کہ کسی خاص مضمون کو مخصوص درجے کے طلبہ اور ان کی تعداد اور استعداد کے مطابق کیسے پڑھایا جائے اور اس کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ یعنی متعلم، مضمون کا وقت، طالب علم کی استعداد اور مقاصدِ تدریس وغیرہ عوامل ہیں جن کے مطابق طریقِ تدریس کا انتخاب ہونا چاہیے۔ بلکہ اب تو ماہرین تعلیم اس سے متفق ہیں کہ اگر تمام طریقوں کے امتزاج سے کوئی نیا طریقہ اختیار کیا جائے تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ گویا عملِ تعلیم میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بچے کی نفسیات

یہ بذاتِ خود ایک بہت وسیع میدان اور اہم مضمون ہے۔ اس پر بعد میں مناسب تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ معلم دورانِ تدریس اصولہائے نفسیات کو ملحوظ رکھے، ورنہ وہ طلبہ اور ان کی تعلیمی ضروریات کو سمجھ نہیں پائے گا اور نادانستہ طور پر اس کا عملِ تدریس ادھورا رہ جائے گا۔

ماحولِ تعلیم (Educational Environment)

پاکستان کے نظامِ تعلیم کے حوالے سے یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ اس لیے اس کی حیثیت ایک بڑے اور اہم مسئلے کی سی ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید آڈیٹوریم اور جدید سہولیات شاید ہی چند کالجوں یا یونیورسٹیوں کے بعض شعبوں میں دستیاب ہوں، ورنہ زیادہ تر ادارے ان سے محروم ہیں۔ ایسا دور بھی پاکستان کے بعض ابتدائی تعلیمی اداروں میں گزرا ہے کہ طالب علم شدید سردی میں بھی ٹھنڈے یخ فرش پر بیٹھنے پر مجبور تھے اور انہیں ٹاٹ تک میسر نہ تھے۔ بلکہ جو بچے ٹاٹ پر بیٹھتے تھے وہ دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ استاد کی ذمہ داری بس یہیں تک ہے کہ جو وسائل دستیاب ہوں ان سے بہترین استفادہ کیسے کیا جائے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے طالب علموں کو اپنی ذہانت اور پیشہ ورانہ دانش سے اس طرح تعلیم دے سکتا ہے کہ انہیں کسی قسم کی کم مائیگی کا احساس نہ ہو، بلکہ انہیں اعتمادِ ذات میسر آئے۔

اس کے علاوہ اسکول کا محلِ وقوع بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ عموماً اسکول ایسی جگہ پر بنائے جاتے ہیں جہاں قریب ہی بس سٹینڈ یا ریلوے اسٹیشن ہو۔ عوام کا حال یہ ہے کہ سکول اور ہسپتال کے سامنے ہارن نہ بجانے کا بورڈ لگا ہونے کے باوجود وہیں پر ہارن بجایا جاتا ہے۔ عین بازار کے بیچ بھی سکولوں کا وجود دیکھا جا سکتا ہے، جہاں چاروں طرف شور ہی شور ہوتا ہے۔ لہٰذا اربابِ اختیار نظامِ تعلیم کے لیے لازم ہے کہ وہ ماحول کے حوالے سے تعلیمی اداروں کی جگہ (location) کا لحاظ رکھیں۔ یہاں آپ کو ایسے ہسپتال بھی ملیں گے جو جوہڑوں کے کنارے قائم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قدیم بغداد میں ہسپتال کی تعمیر کا مسئلہ درپیش ہوا تو شہر کی انتظامیہ نے ایک ماہر کی خدمات حاصل کر کے اس سے اس جگہ کے انتخاب کرنے کو کہا جہاں ہسپتال قائم کیا جا سکے۔ اس نے گوشت کے ٹکڑے لیے، انہیں بانس کے سرے پر باندھا اور کچھ نوجوانوں سے کہا کہ وہ شہر کے مختلف علاقوں میں بانس عمودی طور پر کھڑا رکھیں۔ اس نے دو گھنٹے کے بعد بارہ باری ان گوشت کے ٹکڑوں کا مشاہدہ کیا۔ اکثر جگہ پر دو گھنٹے میں ہی گوشت نے باس دینا شروع کی۔ لیکن ایک جگہ ایسی تھی جہاں گوشت بالکل تر و

تازہ رہا۔ چنانچہ اس نے اس جگہ پر ہسپتال تعمیر کرنے کو کہا اور موجودہ زمانے میں تو ماحولیات کو جانچنے کے کئی طریقے اور وسیلے موجود ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا نظامِ تعلیم اس folk wisdom کو عوام میں فروغ دینے کے قابل ہے؟ اگر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں بعض انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ تعلیمی اداروں میں ماحولیاتی آلودگی کے تدارک کا بندوبست کرنا لازم ہے، جہاں قوم کے نرم و نازک نونہال اکٹھے ہوتے ہیں۔ کمرۂ جماعت میں نشستوں کی نوعیت اور ترتیب اور نشست و برخاست کے آداب کی تعلیم بھی عام کرنے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے ماحول میں بھی اکثر اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ طلبہ جہاں بیٹھیں وہاں صفائی ستھرائی کا خیال رکھا گیا ہو۔ تعلیمی اداروں میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ طلبہ میں ماحولیاتی اہمیت کا ذوق پروان چڑھے۔

جائزہ اور آزمائش

یوں تو دنیا بذاتِ خود ایک درسگاہ ہے، جس میں انسان خود کار طریقے سے بھی سیکھتا ہے۔ مگر جب کوئی باضابطہ تعلیمی ادارہ قائم ہو تو اس میں آزمائش، پیمائش اور جائزے کا باقاعدہ میکنزم ہونا چاہیے، تاکہ آگے بڑھتے ہوئے تعلیمی عمل کی کامیابی کو پرکھا جا سکے۔ طالب علموں کے achievement test بھی دراصل عملِ تعلیم ہی کو ماپنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ امر ذہن میں رہنا چاہیے کہ انسان کی پوری زندگی ہی ایک امتحان ہے۔ کیونکہ یہ دنیا خیر و شر کی رزمگاہ ہے۔ اس لیے کمرۂ امتحان میں کسی بھی طرح سے کامیابی کا سوچنا اور عملی زندگی کی آزمائش اور امتحان کے لیے تیاری نہ کرنا ادھوری یا ناقص سوچ کا مظہر ہے۔ عموماً طالب علموں کے تعلیم کے حوالے سے رویوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تکلف دہ بات سامنے میں آتی ہے کہ چاہے آپ زندگی سے متعلق کتنی ہی مفید باتیں کر رہے ہوں، اگر سالانہ امتحان میں ان اُمور کے لیے کوئی نمبر مخصوص نہیں ہیں تو شاید ہی کوئی ان کی طرف ارتکازِ توجہ کرے، خواہ وہ عمل زندگی کے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ رہا ہو۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ چونکہ علم کا تعلق پوری زندگی کے ساتھ ہے اس لیے جو کوئی بھی جہاں بھی علم دینے کی سرگرمی میں مصروف ہو، اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس جذبے کے ساتھ حاصل کیے گئے علم سے یہ ہوتا ہے کہ جہاں جہاں متعلم زندگی میں کامیابیاں حاصل کرتا ہے، معلم اور درسگاہ کو بھی اس کا کریڈٹ ملتا ہے۔

ہم نصابی سرگرمیاں

کسی زمانے میں اس کے لیے غیر نصابی سرگرمیوں کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر لوگوں کے خیال میں ایسی سرگرمیوں کی اکیڈمک قدر نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جیسے جیسے تصورِ تعلیم شفاف تر ہوتا گیا، تمام ماہرینِ تعلیم اس سے متفق ہوتے گئے کہ جس قدر افادیت درسی کتب کی ہے اس سے زیادہ ایسی بظاہر اضافی سرگرمیوں کی ہے۔ اس لیے ان کا مناسب نام معاونِ نصاب سرگرمیاں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نصاب کی تدوین اور درسی کتب کی تیاری کے دوران ایسی سرگرمیوں کی میپنگ کی گئی ہو (کب، کہاں، کون سی سرگرمی آئے گی؟)۔ اس حوالے سے ان سرگرمیوں کو درسی مواد کا جائز حصہ سمجھنا چاہیے۔ جبکہ عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ پورے سال میں چند دن کھیلوں کے ہفتے کے طور پر منا لینا کافی سمجھا جاتا ہے، جو درست نہیں۔ ایک تو انہیں معقول تناسب کے ساتھ ہونا چاہیے، دوسرے اُن کا پورے سال پر پھیلا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان میں مکالمے، مباحثے، تقریری مقابلے، مضمون نویسی کے مقابلے، نعت خوانی، ملی نغموں کی گائیکی اور ذہنی آزمائش جیسی سرگرمیوں کے ساتھ کھیلوں کے مقابلے بھی شامل ہونے چاہییں یہ خیال بھی رہے کہ سالانہ کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں کے مقابلوں میں جہاں ہاؤس ٹیمیں شامل ہوتی ہیں، اس کے بجائے پورے سال کے دوران اندرون کلاس مقابلوں سے بچے منتخب ہو کر ہاؤس ٹیموں کا حصہ بنیں، تاکہ انتخاب سے پہلے عملی مقابلوں کی صورت میں تربیت کا کچھ پہلو ملحوظ رکھا جا سکے ہم نصابی سرگرمیوں میں اب تو

علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے مقابلے ہوتے ہیں تعلیمی اداروں کو اس حوالے سے طلبہ کی رہنمائی اور مواقع فراہم کرنے چاہییں۔

درسی کتابوں کے مقابلے میں ایسی مجالس سے طالب علم زیادہ سیکھتے ہیں جو وہ خود منعقد کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا سرگرمیوں کے مواد سے تو سیکھنا ہوتا ہی ہے، ان کے انعقاد کے عمل سے عملی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے، جن کی تربیت کتب کے مندرجات سے ممکن نہیں۔ اس لیے ایسی سرگرمیوں کو غیر نصابی سرگرمیوں سے معاونِ نصاب سرگرمیوں کے درجے تک لانا کافی نہیں بلکہ انہیں نصاب کا براہِ راست حصہ ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے ایک مثال شاید مفید مطلب ثابت ہو۔ عموماً اساتذہ بزعمِ خود اپنے خطاب کو یکطرفہ طور پر انتہائی کامیاب قرار دے کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، مگر یہ جاننے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے کہ طلبہ اس سے کس قدر مستفید اور لطف اندوز ہوئے اور اس کا تأثر ان کے لیے کس حد تک دیرپا ثابت ہوتا ہے؟ گویا اصل بات یہ نہیں کہ استاد نے کیا دیا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ طالب علموں نے کیا لیا ہے۔

مندرجہ بالا بیشتر معلومات کا تعلق جس نظامِ تعلیم سے ہے وہ باضابطہ اور منظّم تعلیمی اداروں سے وابستہ ہے جبکہ تعلیم کا عمل اس کے علاوہ بھی جاری رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم نے تعلیم کی تین صورتوں کا ذکر کیا ہے۔

رسمی تعلیم

رسمی تعلیم کو controlled education بھی کہا جاتا ہے۔ ایک منظّم طریقے سے طے شدہ مقاصد کے ساتھ معین اوقات میں باضابطہ اداروں کی طرف سے دی جانے والی تعلیم رسمی تعلیم کہلاتی ہے۔ اس میں باقاعدہ معاوناتِ تعلیم مہیا کیے جاتے ہیں اور امتحانات و نتائج بھی اسی کا حصہ ہوتے ہیں۔

نیم رسمی تعلیم

نیم رسمی تعلیم کے مندرجات رسمی تعلیم جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ معاوناتِ عملِ تعلیم بھی یکساں ہوتے ہیں۔ مگر اس میں وقت پورا نہیں ملتا اور اوقات کار میں بھی رعایت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسباب و وسائل بھی میسر نہیں ہوتے۔ ایسے خصوصی منصوبے (projects) متعارف کرائے جاتے ہیں جن کے ذریعے مختلف طبقات (مثلاً سرکاری ملازمین کو بعد از اوقاتِ ملازمت)، کسانوں، خواتین خانہ اور کاروباری حضرات جیسے طبقوں کو ان کی ضروریات کے مطابق علم فراہم کیا جاتا ہے۔ [علامہ اقبال یونیورسٹی میں ایسے کئی منصوبے روبہ عمل ہیں]۔ اس میں نصاب، نظام الاوقات، استاد، امتحانات اور نتائج سب کچھ موجود ہوتا ہے۔

غیر رسمی تعلیم

غیر رسمی عملِ تعلیم پوری زندگی ساتھ چلتا ہے۔ بلکہ اسے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی چلایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے زمانہ استاد اور دنیا کتاب کا رول ادا کرتی ہے۔ جبکہ مختلف انسانوں کا ماحول کے خلاف ردّعمل بھی دراصل عملِ تعلیم ہوتا ہے۔ [اس کی ایک دوسری شکل بھی ہے۔ یہ وہ ہنر ہے جو کوئی فرد اپنے پیشہ ور بھائی اور والد سے سیکھتا ہے۔ مثلاً دورانِ رسمی تعلیم بھی ایک طالب علم فرنیچر کے کارخانے میں اپنے بھائی اور والد سے سیکھی ہوئی مہارتیں استعمال کر کے کام کر سکتا ہے]۔ معاشرے میں کوئی فرد جو کچھ کر رہا ہوتا ہے، وہ اس کا کردار بنتا جاتا ہے۔ اور وہی کردار درحقیقت استاد ہے۔ کیونکہ اسی کردار کی روشنی میں انسان زندگی میں اپنی شمولیت کی حدود متعین کرتا ہے۔ سیکھنے کے دوران فرد کسی کردار سے متأثر ہو کر اُسے یا تو اپنا لیتا ہے یا پھر اس کے خلاف ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے ایک متبادل کردار اختیار یا تشکیل کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال انسانی رشتوں، محبتوں اور چاہتوں میں نظر آتی ہے کہ یا تو انسان کسی فرد کو حاصل کر لیتا ہے یا ردّعمل کے طور پر اس سے متنفر ہو جاتا ہے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد　　گو محبت نہیں، عداوت ہی سہی

بعض ماہرینِ معاشرت کا خیال ہے کہ نفرت بھی محبت ہی کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ لہٰذا بنیادی وجود محبت کا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے خالد رحمٰن صاحب (ڈائریکٹر جنرل آئی پی ایس) نے چین کے ایک شہر میں احتجاج کا ایک دلچسپ طریقہ دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بینر لگا ہے جس پر صرف ایک جملہ کسی ملک کے آمرانہ رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھا تھا۔ اور معاشرے کے جو افراد وہاں سے گزر رہے تھے اگر اس احتجاجی جملے کو پڑھ کر اس سے متفق تھے تو اس بینر پر اپنے اپنے دستخط کرتے جا رہے تھے۔ یہ بھی ردِّعمل کا ایک مؤثر طریقہ ہے، مگر اس میں تشدد کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں مار دھاڑ اور جلاؤ گھیراؤ کا طریقہ عام ہے۔ اسی دوران انتظامیہ بھی پُرامن مذاکرات پر یقین نہیں رکھتی بلکہ پولیس کو بلا کر مظاہرین پر تشدد کی راہ اپنائی جاتی ہے۔ اس طرح دونوں جانب انتہا پسندانہ رویہ ہی سامنے آتا ہے اور ملک میں مسلسل خانہ جنگی کی سی صورتِ حال پائی جانے لگتی ہے۔ اگلے روز متاثرینِ پولیس کے حمایتی ساتھی ایک اور جلوس نکالتے ہیں اور اپنے گرفتار ساتھیوں کی رہائی کے لیے نعرے لگاتے ہیں۔ اب ان کے سارے احتجاج کا محور لوگوں کو رہا کرانا رہ جاتا ہے اور اصل مسئلہ پسِ پشت چلا جاتا ہے۔

تعلیم عمل اور ردِّعمل دونوں کا جائزہ لینے میں انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔ تعلیم ایک دن کا عمل نہیں۔ ایک تو یہ مشقت طلب ہے، دوسرے مسلسل ہے۔ زندگی میں اس کا مکمل ہونا ممکن نہیں۔ آپ خود مشاہدے سے تصدیق کر سکتے ہیں کہ جو شخص تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے مسلسل مشقت سے گزرنا پڑتا ہے، جبکہ جو شخص جاہل رہنا چاہتا ہے اُسے مشقت کی حاجت نہیں ہوتی۔ پاکیزہ کردار رہنے کے لیے حصولِ علم کا سلسلہ مسلسل جاری رکھنا پڑتا ہے۔ صاف ستھرا رہنے کے لیے تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے، مگر گندہ رہنے کے لیے کسی تردّد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح ترقی کے لیے جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے، مگر جو ترقی کو ضروری نہیں سمجھتا جس طرح چاہے تن آسانی سے رہ سکتا ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ آسائشیں تو ترقی ہی کی صورت میں ملیں گی جن کے لیے مشقت طلب زندگی ضروری ہے۔ بلندی کی طرف جانا مشقت طلب کام ہے، جبکہ نیچے لڑھکنے میں کسی مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسانی زندگی سے اس حوالے سے ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کے ساتھ محنت کو منسلک کیے بغیر مقاصد کا حصول ممکن نہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

گویا تعلیمی اداروں میں محبت کا وجود، معرفت کی ترقی پسندانہ سوچ اور دور رَس نگاہیں نہ ہوں تو زندگی غمکدہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح اگر انسان نگاہ [بصیرت، (vision)] سے عاری ہو تو مستقبل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی منصوبہ بندی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، اور اس طرح تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ حالات کے نامساعد ہونے کی صورت میں نوحہ و فغان کرنے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے مایوسی کے عالم میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں، بلکہ جس قدر حالات خراب ہوں، زندہ قومیں اسی قدر زیادہ مشقت کو شعار بناتی ہیں، تاکہ حالات کو اپنے حق میں تبدیل کر سکیں۔ جو قومیں اُمید کا دامن تھامے رکھتی ہیں وہ ہر صورت حالات کا روشن پہلو دیکھ کر اس سے سیکھتی ہیں۔

سینۂ بلبل کے زنداں سے آزاد ہے　　سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

کسی روز طلوعِ آفتاب سے قبل اپنے گھر کے روزن سے باہر جھانکیے، آپ کو مرغانِ چمن کی نغمہ سرائی مسحور کر دے گی۔

خفتگانِ کوہسار و لالہ زار و رود بار　　ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

اگر انسان صرف بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے لالہ زاروں، کوہساروں اور رود باروں کو دیکھ سکے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ حسن تو شہر کے ہنگاموں سے دور ایسے نظاروں میں منور ہے۔

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے　　ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اسی طرح ایسے مشاہدے سے ادراک ہوتا ہے کہ ایک ایک منظر زندگی میں ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح　　مرقدِ انسان کا پھر کیوں نہ ہو انجام صبح

بقولِ شاعر:

رات جتنی بھی سنگین ہوگی　　صبح اُتنی ہی رنگین ہوگی

غم نہ کر ہے بادل گھنیرا　　کس کے روکے رُکا ہے سویرا!

انسان اپنا مقدر (اکثر صورتوں میں) خود لکھتا ہے۔ اس لیے اگر وہ ہمت کر کے تاریک رات میں ایک چراغ جلا دے تو اس کی صبح میں تاخیر نہ ہو سکے گی۔

امید ہے کہ اس بحث سے تعلیم کے تصورات واضح ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے عمل کو کامیابی سے آگے بڑھانے میں بھی مدد ملے گی۔ ان شاء اللہ

سوال و جواب

سوال: قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا طریقِ تدریس آج سے مختلف تھا۔ اس وقت استاد کے درس میں بے پناہ وسعت ہوتی تھی۔ آج کے استاد کا دائرۂ درس بے حد محدود ہے۔ اسے آپ کیسے دیکھتے ہیں؟ کیا یہ مثبت تبدیلی ہے؟

جواب: ہر دور کا تجربہ کچھ نہ کچھ کامیابیاں لے کر آتا ہے اور اس میں کچھ خامیاں اور کمیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایک وقت یقیناً تھا کہ لوگ استاد کے پیچھے بھاگتے تھے۔ دور کہیں کسی اجنبی دیس میں کسی نامور استاد کی موجودگی کی خبر ملتی تھی تو طالب علم (جویائے علم) کی خواہش ہوتی تھی کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ اور یہ اساتذہ اپنے اپنے میدانِ درس کے سپیشلسٹ ہوتے تھے: قرآن، حدیث، فقہ، طب، فلکیات، نجانے کن کن شعبوں کے ماہرین ان میں شامل تھے۔ اسی طرح مختلف زبانیں سیکھنے کے شائق افراد ماہرینِ لسانیات کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ جب ہم اس زمانے سے متعلق جائزہ لیتے ہیں تو منکشف ہوتا ہے کہ ایسے طالب علم جب کسی قابلِ ذکر علمی مرتبے پر پہنچ جاتے تھے تو ان کے پاس کسی تعلیمی ادارے کی سند نہیں ہوتی تھی بلکہ مخصوص استاد کی طرف سے جاری کردہ سند ہوتی تھی۔ اسے شہادت کہتے ہیں۔ گویا یہ اس امر کی گواہی ہوتی تھی کہ فلاں شخص فلاں استاد کے پاس فلاں عرصے میں مذکورہ مضمون/مضامین میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور اس کی صلاحیتوں (بعد از تعلیم) کو جانچنے کے بعد اس امر کا اندازہ لگا لیا گیا ہے کہ وہ مذکورہ فن کا ماہر ہو چکا ہے۔ استاد کی طرف سے جاری کردہ تحریر کسی یونیورسٹی کی طرف سے جاری کردہ ڈگری سے کم مرتبہ نہیں ہوتی تھی۔ جب تعلیمی ادارے وجود میں آئے تو فری لانسر اساتذہ بھی ان اداروں سے منسلک ہو گئے اور اس عمل نے باقاعدہ ایک نظام کی حیثیت اختیار کر لی۔ جب اداروں میں کئی کئی مضامین کے متعدد اساتذہ موجود ہوں تو ایک فرد کو تخصیصی تعلیم کے لیے ملکوں ملکوں مسافروں کی طرح پھرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس وقت یہ عمل استاد کے گرد گھومتا تھا تو وہاں بھی کوئی ایک طریقہ رائج نہیں تھا۔ ابھی جس discussion method کی بات کی گئی ہے یہ قدیم زمانوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ یونان کا معروف فلسفی اور استاد ارسطو اسی طریقے کا حامی اور ماہر تھا۔ اس نے بحث اور سوال و جواب کے ذریعے تعلیم دینے کے طریقے کو رواج دیا۔ اس کے بعد کے زمانوں سے متعلق بھی ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ کوئی طبقہ اور کوئی قوم نظر نہیں آتی جس کے افراد نے بحث و تمحیص اور سوال و جواب کے طریقے کو درس و تدریس میں استعمال نہ کیا ہو۔ طریقہ ہائے تدریس میں ایک زبردست تنوع موجود ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ تمام طریقے کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ اگر کسی مخصوص زمانے کے حوالے سے کسی ایک

طریقے کا ذکر ملتا ہے تو اس کے پیچھے یہ حقیقت ملتی ہے کہ اس خطے کے معروف اساتذہ نے زیادہ تر اسی طریقِ تدریس کو دوسروں سے اُس مخصوص صورت میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہوگا۔ اس سے یہ مطلب کبھی نہیں لینا چاہیے کہ اس معروف طریقہ کار کے علاوہ اس خطے یا زمانے میں اور کوئی طریقۂ تدریس رائج ہی نہ تھا۔ تاہم یہ طے ہے کہ حسبِ ضرورت ہر طریقے کو استعمال کرنا ممکن ہے۔

پاکستان میں کافی عرصے سے انگریزی زبان کی تعلیم دینے میں جزوی طریقۂ تدریس اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں اشیاء کی شکلوں کی مطابقت سے ایک ذخیرۂ الفاظ طے کر لیا جاتا ہے۔ اسے جب طالب علم خوب ذہن نشین کر لیتے ہیں تو اُنہیں لسانی ساختیات (گرامر و کمپوزیشن) کی طرف لایا جاتا ہے۔ اس مرحلے پر الفاظ سے مرکبات (phrases & clauses) اور ان سے جملہ اور جملوں سے مسلسل انشاء کی طرف لایا جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس قدیم طریقے کی جگہ اب جدید دور میں انگریزی (یا کوئی بھی) زبان سکھانے کے لیے direct method رائج ہو چکا ہے، تو ایسے موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ direct method تو تب سے وجود میں ہے جب سے انسان وجود میں آیا ہے۔ جب سے مختلف زبانوں میں اظہارِ خیال کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اسی وقت سے زبان سکھانے کے لیے direct method موجود ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سارے طریقے دائرۂ علم میں نہ جانے کب سے موجود ہیں اور کوئی ایک استاد، کوئی ایک طریقہ اختیار کر کے اسے رواج دے دیتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی ایک طریقے کو حرفِ آخر سمجھنا درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عمومی طور پر جدید اندازِ تدریس پرانے طریقوں سے مقابلتاً بہتر ہے، کیونکہ اس میں طالب علم کی شرکت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

طالب علموں کے سوالات کو دبانا یا ردّ کرنا یا سوال پوچھنے والے طالب علم کی حوصلہ شکنی کرنا اس استاد کی اپنی کمزوری اور خامی کی دلیل ہے۔ ایسا استاد اس خوف سے طلبہ کو سوال پوچھنے پر اکسانا تو دور کی بات اُنہیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ کبھی وہ کسی سوال کا جواب نہ دے پایا تو کیا ہوگا۔

یہ اُس کے اعتمادِ ذات کی کمزوری کی علامت ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا علم انسانی جبلت پر ایک قدغن نہیں ہے؟

جواب: سچ تو یہ ہے کہ علم انسانی جبلت کو نکھارتا ہے۔ جبلت کوئی ایسی شے نہیں جو انسان کو باندھ کر رکھ دے، بلکہ اس کا ایک خاص اور محدود دائرہ ہے۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے انسان بعض مخصوص قسم کے کام کرتا ہے۔ یہ جبلت ہی ہے جو پرندوں کو اُڑنا اور مچھلیوں کو تیرنا سکھاتی ہے۔ اسی طرح انسانی جبلت کا تعلق انسان کے ان اعمال سے ہے جو تخلیق کے مرحلے سے ہی انسانی وجود کے ساتھ منسلک ہے۔ [دیگر مخلوقات کے برعکس انسان کو محض جبلی بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن پر عمارت کی تعمیر انسان کا اپنا کام ہے، جس کے لیے اُسے استاد یعنی اس کے عملِ تعلیم کی حاجت ہوتی ہے، جو ہمیشہ موجود رہتی ہے]۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کے انسان بعض صورتوں میں بالکل ایک جیسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً رونا، ہنسنا، کراہنا اور گنگنانا وغیرہ کے افعال پوری دنیا میں یکساں صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ مظاہر چونکہ انسانی جبلت کے ہیں اس لیے ان میں ایک ہم آہنگی اور یکسانیت موجود ہونا فطری امر ہے۔ لہٰذا علوم جبلت پر قدغن نہیں لگاتے بلکہ اس میں تزئین اور تقویت کا سبب بنتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بھی استاد نے طالب علموں کو ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' جیسے پیغام پر عملدرآمد سے کبھی روکا نہ تھا۔ ایک مثال تو قدیم یونان ہی کی ہے۔ مثلاً افلاطون کے بہت سے افکار سے ارسطو نے اختلاف کیا [اور بالکل نئی تعریفیں پیش کیں]۔ اور ارسطو سے سقراط وغیرہ نے اختلاف کیا۔ مسلم دنیا میں ابو یوسف نے امام نعمان بن ثابت (امام ابوحنیفہؒ) سے اختلاف کیا۔ یہ اختلاف — جو فکر کی راہیں متعین کرنے کے حوالے سے سامنے آئے — علم کی راہ پر آگے بڑھنے کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ خالقِ کائنات کا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو درکار تمام تر صلاحیتیں (حیوانوں کی طرح) ساری کی ساری تیار شدہ صورت میں مہیا نہیں کی جاتیں۔ اس کے بجائے انسان کو بے پایاں صلاحیتوں کی صرف بنیاد فراہم کی جاتی ہے اور ترقی کو انسان کی اپنی

کوشش سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ (لیس للا نسانِ اِلّا ماسعٰی یعنی انسان کے لیے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے)۔ اس لیے محدود کارکردگی کی جبلت کی آزادی نباتات اور حیوانات کے لیے تو ممکن ہے، انسان کے لیے نہیں۔ آزادی کو پابندیوں کی حدود میں رہ کر آگے بڑھنا ہی عظمت کی دلیل ہے۔ کیونکہ مادر پدر آزادی حقیقی آزادی نہیں بلکہ جہاں سے کسی دوسرے فرد کی ناک شروع ہوتی ہے، وہاں سے دوسرے فرد کی آزادی بھی شروع ہوتی ہے اور کسی دوسرے فرد کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا آزادی نہیں بلکہ جرم ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک آزادی کا تصور یہ ہے کہ

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے　　انہی پابندیوں سے حاصل آزادی کو تُو کر لے

اس اعتبار سے آزاد بندوں کی طرح اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اس ضمن میں حقیقی آزادی اور مادر پدر آزادی کے تصور سے آگاہی ضروری ہے۔

وہ ایک حدّ ادب ہمیشہ برقرار رہنی چاہیے، جو باپ، بیٹے، ماں، بیٹی اور استاد و شاگرد میں موجود ہے کہ ان کا نام لینا خلافِ ادب سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ شعار بن چکا ہے تو اسے جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ نام لینے کے بجائے کسی بزرگ کو اس کی کسی خوبی سے ظاہر کیا جائے تو اس میں اور بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔